ڈاکٹر اشفاق احمد ورک
پروفیسر
شعبۂ اردو، ایف۔سی کالج یونیورسٹی، لاہور

مشتاق احمد یوسفی اور ''شامِ شعرِ یاراں''
(مطالعے، مغالطے اور معاملے)

ABSTRACT

Mushtaq Ahmed Yousufi and Shaam-e-Sheir-e-Yaraan (Readings, Fallacies and facts)

By Dr. Ashfaq Ahmed Virk, Professor, Department of Urdu, F.C college University, Lahore.

In 2014, when the fifth book "Sham-e-Shair-e-Yaran" by the great Urdu Humorist Mr. Mushtaq Ahmed Yousufi was published, many literary circles or certain media tried to make it controversial. Some said it was not printed with Yousifi's consent, some pointed fingers at its literary quality and some even called it Yousafi's "dustbin's trash" in opposition to those who arranged the publication of the book. However, the fact is that this book is in no way inferior to the standard set by Yousufi.

The article under review attempts to provide an unbiased analysis of the book as well as to give a reasoned answer to the objectionable arguments and objections of the protesters.

دوستو! یہ تین دہائیاں اُدھر کا قصہ ہے جب مَیں نے سیالکوٹ کینٹ میں ظفر علی خاں روڈ کی بغل میں واقع، اور اُسی سال آغاز پانے والے ایف جی کالج میں 'استادی' کا نیا نیا ڈول ڈالا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جس شہر میں ایک صدی قبل میرے پسندیدہ ترین شاعر اقبال، کالج میں پڑھ رہے تھے، مَیں وہاں کالج میں پڑھانے آ گیا تھا۔ ابھی اس شہر میں کرائے کے مکان اور کیے کرائے کی اطلاع دینے کے لیے اپنے یونیورسٹی کے کلاس اور قیاس فیلوز کو تلاش کر رہا تھا کہ کسی مزاج شناس نے خبر دی کہ 'زرگزشت' کے چودہ سال کے سفاکانہ اور تھکا فانہ وقفے کے بعد جناب مشتاق احمد یوسفی کے ہاں 'آبِ گم' تولد ہوئی ہے۔ یہ خبر پاتے ہی مَیں نے بھی بے شمار مشتاقانِ یوسفی کی طرح قریب ترین بک سٹال کا ایسے رُخ کیا، جیسے پنجابی فلموں میں سلطان راہی کا گھوڑا چیخ دار ہنہناہٹ کے ساتھ پچھلے قدموں پہ کھڑا ہو کے یوٹرن لیا کرتا تھا۔ پلک جھپکتے میں ہم نے سیالکوٹ صدر میں ادبی کتب کے حامل اکلوتے 'ماڈرن بک ڈپو' سے مذکورہ کتاب کا اکلوتا نسخہ دکان دار کی منھ مانگی قیمت پہ اُڑا

لیا۔ نہ صرف اُڑا لیا بلکہ دنیا داری کی ہر مصروفیت کو دائیں بائیں کر کے پہلی فرصت میں سُڑک ڈالا۔

کتاب کیا تھی؟ اُردو نثر کا ایک انوکھا نگار خانہ تھا۔ ہمارے ناقدین و ناقصین نے اسے دیکھ کے پہلے انگلیاں اٹھائیں، پھر دانتوں میں داب لیں۔ کسی نے کہا ناول ہے، کوئی بولا: افسانے ہیں افسانے .....کسی نے اس پہ خاکوں کی پھبتی کسی۔ کسی کی رائے میں وہ مضامین کا مجموعہ تھا۔ ایک طرف سے بائیوگرافی کی آواز آئی۔ بیچ بیچ میں آٹو بائیوگرافی کی کھسر پھسر بھی چلتی رہی۔ بعض نے بیٹھے بٹھائے اسے سفرنامہ قرار دے ڈالا اور کوئی اُکسا کہ کچھ نہیں محض مزاح پارے ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ وہ کتاب ان 'خادشین' کی جملہ خواہشات و توقعات پر عین مین پورا اُترتی تھی۔ بیان کا ایسا کمال سلیقہ اور نثر کی ایسی عمدہ دھاک کہ ہم تو بلا جھجک اور سیدھے سبھاؤ پکار اُٹھے کہ اگر دیگر ممالک کی مانند اُردو نثر کی کتابوں کو بھی صدیوں پہ محمول کیے جانے رواج بار پا جائے تو انیسویں صدی کی نمایندہ کتاب بلا شبہ مولانا محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' ٹھہرے گی اور بیسویں صدی کے ماتھے کا جھومر بننے سے 'آبِ گم' کو کوئی نہ روک سکتا۔ ایسی کثیر الجہات اور بہت سی اصناف پہ مَلّ مار لینے والی کتاب کہ مجھے پنجابی کے لاجواب شاعر بشیر باوا کا محبوب کی ستائش در ستائش میں لکھا گیا وہ انوکھا قصیدہ یاد آ گیا:

تیرے رُوپ سروپ انوپوں ٹھنڈ سمے نوں پیندی
بدّل، برق، کڑک، لشکار ایں، اوس کہیا مَیں چارے
اگر، مگر، تگر، کستوری، عنبر، تئیں چوں ہُلّن
خُوشبو، باس، مُشک، مہکار ایں، اوس کہیا مَیں چارے
تیریاں چھیویں حِسّاں تیرا جسم معطر کیتا
عود، گلاب، حنا، عطار ایں، اوس کہیا مَیں چارے (۱)

'آبِ گم' کے بعد یوسفی صاحب حسبِ عادت ایک بار پھر ادبی اعتکاف میں چلے گئے۔ اس بار جب اعتکاف کا دورانیہ شبِ ہجراں سے بھی زیادہ طویل ہوتا دکھائی دینے لگا تو غالباً ۲۰۱۰ء میں (یعنی آبِ گم کی اشاعت کے بیس سال بعد) جب مَیں نے ایف سی یونیورسٹی میں بی ایس آنرز کی سطح پر پڑھانے کے لیے طنز و مزاح کا ایک کورس متعارف کرایا، جس میں طنز و مزاح کا تعارف، طنز اور مزاح میں فرق، طنز و مزاح کی تاریخ، مزاح ایک معاشرتی ضرورت، مزاح کے حربے وغیرہ جیسے موضوعات کے ساتھ ساتھ، چار نثر نگاروں (پطرس بخاری، ابنِ انشا، کرنل محمد خاں، مشتاق احمد یوسفی) اور چار شاعروں (اکبر الٰہ آبادی، سید محمد جعفری، سید ضمیر جعفری، انور مسعود) کی منتخب تحریروں کا خصوصی مطالعہ شامل تھا۔ طلبہ و طالبات کے لیے تازہ معلومات کی خاطر یوسفی صاحب کو فون کیا (وہ موبائل استعمال نہیں کرتے تھے اور پی ٹی سی ایل پر مجھے ہفتے میں دو ایک بار یا حسبِ طلب فون کی خصوصی اجازت تھی) کہ محترم 'آبِ گم' آج سے بیس برس قبل شائع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ جو نسل پیدا ہوئی تھی، وہ اب جوان ہو گئی ہے اور پوچھتی ہے کہ 'یوسفی صاحب کہاں ہیں؟'

دھیمی دھیمی ہنسی ہنستے ہوئے بولے: بھئی لگا ہوا ہوں، چار سو صفحے لکھ چکا ہوں، اس موضوع کو مکمل کرنے کے لیے کم و بیش اتنے ہی صفحات اور لکھنا ہوں گے۔

عرض کیا: چار سو صفحات تو بہت ہوتے ہیں، ان کو تو چھپوا دیں!

کہنے لگے: بھئی ابھی تو اس کا ہیرو پیدا ہوا ہے!!

پوچھا کہ یہ بھی کوئی 'آبِ گم' قسم کی چیز ہے؟

فرمانے لگے: نہیں! یہ اس سے بالکل مختلف ہے، اب کے ایک اور ہی طرف نکل گیا ہوں۔ اس کو مکمل کر کے صاف کروں گا، پھر دیکھوں گا۔ اگر تب تک اس کے معیار سے مطمئن ہوا تو یہ چھپ جائے گی وگرنہ جو کچھ لکھا ہے، بہت ہے!! آج اس فون والے واقعے کو بھی دس برس ہونے کو آئے ہیں بلکہ اب تو یوسفی صاحب کی وفات کو بھی دو سال ہو چکے۔ گزشتہ سال نیشنل بک فاؤنڈیشن سے 'عالم میں انتخاب' (یوسفی صاحب کے پانچوں مجموعوں سے انتخاب) کی اشاعت کے دوران یوسفی صاحب کے اہلِ خانہ بالخصوص سروش یوسفی صاحب سے مسلسل رابطے اور اس امر کی یاد دہانی کے باوجود اس مسودے کا معمہ حل نہیں ہو سکا۔

بہرحال ۲۰۱۴ء کے اواخر میں ''شامِ شعر یاراں'' کی اشاعت کی خوش کُن خبر سماعتوں کا حصہ بنی۔ کتاب پہلی فرصت میں حاصل کی اور رکے رکے، مزے لے لے کر پڑھتے ہوئے، ۱۹ جنوری ۲۰۱۵ء کی دوپہر دو بج کر بیس منٹ پر ختم کی۔ دیانت داری کے ساتھ محسوس کیا کہ یہ مزاح، دانش، ریاضت، دور اندیشی اور مختلف شخصیات اور موضوعات پر مزے دار تبصروں سے لبالب کتاب ہے۔ اب کے اس کتاب کی اشاعت و حصول سے متعلق ہمارے حرف شناس دوست پروفیسر جمیل احمد عدیل کا اشتیاق و وارفتگی ملاحظہ فرمائیے:

> ''آج صبح رفیقِ مکرم اعجاز خاور نے خوشی خوشی خبر سنائی: مشتاق یوسفی کی نئی کتاب چھپ گئی ہے..... ہمارے حبیب تو 'نویدِ مسرت' کانوں میں انڈیل کر روانہ ہو گئے اور ہمیں دفتر میں وقت کاٹنا قیامت ہو گیا کہ اس تصنیف کا چوبیس سال آٹھ ماہ انتظار کیا تھا۔ اب چوبیس برس آٹھ ماہ کتنے ہوتے ہیں؟ یہ تو ن م راشد کا حسن کوزہ گر بھی نہیں بتا سکتا جس نے جہاں زاد کے باہر محض نو برس مٹی کے برتن بنا کر احسان جتلانے کی روش اپنا لی تھی۔ کم ظرف ظروف ساز! آخر ہم نے تحریری طور پر جزوی رخصتِ اتفاقیہ حاصل کی اور کوئی دس کلومیٹر کا سفر ہرج مرج کھینچ کھانچ کر کتابوں کے شو روم میں جا پہنچے۔ فروری ۱۹۹۰ء میں 'آبِ گم' شائع ہوئی تو ہم صرف اس کے حصول کی خاطر دو سو پچاس کلومیٹر کا سفر طے کر کے لاہور پہنچے تھے۔ اس سے قبل چراغ تلے، خاکم بدہن اور

زرگزشت کو بھی ہم نے ایسے ختم کیا تھا جیسے کوئی حریص بچہ لذیذ ڈش تیزی سے چٹم کر جاتا ہے۔ واپسی پر فوٹریس کے سامنے گاڑیوں کی لمبی قطاریں، ناکے پر زبردست چیکنگ، ہم سوچ رہے تھے کہ ہمارے پہلو میں تو یوسفی کی 'شامِ شعر یاراں' ہے، سو ہر ستم اور اذیت ہنسی خوشی سہے جا رہے ہیں۔ یہ جو ہمارے ارد گرد ہزاروں مرد و زن ہیں، انھیں تو کوئی ایسی ایکسائیٹ منٹ بھی نہیں، جانے اس عذاب کو یہ کس آسرے پر برداشت کر رہے ہوں گے؟''(۲)

'آبِ گم' سے تقریباً ربع صدی بعد منظرِ خاص پہ آنے والی ۴۳۷ صفحات پر مشتمل جناب یوسفی کی یہ آخری اور بھرپور کتاب کل اکیس مضامین/ خاکوں/ یادداشتوں/ اور بعض تقریباتی تحریروں کی حامل ہے۔ کنجوسی اور احتیاط کا یہ عالم کہ تحریروں کی تعداد ایک فی سال بھی نہیں بنتی۔ چند مضامین اگرچہ مختلف تقاریب کے منتظمین کی فرمائش پر لکھے گئے ہیں لیکن خوب ہیں۔ پہلا مضمون ''قائداعظم فوج داری عدالت میں: بحیثیت وکیل صفائی (پسِ 'زرگزشت' کا ایک بابِ خواب تمثال) کتاب کے ۳۲ صفحات کی زینت ہے۔ مضمون کے آغاز میں مصنف کی آگرہ سے گریجویشن اور مزید تعلیم کے حصول کی پر لطف روداد ہے۔ آگرہ کے حوالے سے ان کے لنگوٹیے دوست جناب مسرور حسن خاں کا بڑا بھرپور اور کرارا خاکہ ہے۔ یہی دوست ان کی قائد سے ملاقات کی سبیل بنتے ہیں۔ یہ یوسفی صاحب کے قلم سے قائد کی شخصیت کے نہایت گہرے اور سنہرے نقوش کا مرقع ہے۔ کچھ مثالیں:

☆ فرمایا: سمجھ دار آدمی کو جو کچھ دیکھنا ہو اور نظّارگی کی جتنی ہوس اور حوصلہ ہو، اس کی گنجائش پہلی ہی نظر کے الاسٹک دورانیے میں نکال لیتا ہے۔ دوسری، تیسری پاپی نظر تو اناڑی ڈالتے ہیں یا ناقابلِ اصلاح نظر باز، یا پھر نمبر سے اُتری ہوئی عینک لگانے والے بڈھے ٹھرکی۔

☆ اس وضاحت کے بعد مَیں انھیں آپ کے بجائے تم کہنے لگا، جو لہجے اور نیت کے لحاظ سے ''تُو'' سے بھی آگے کی چیز ہے۔

☆ مَیں نے ان کا جی بہلانے کے لیے کہا: حضرت! میری گرانیٔ طبع اور پریشانی کے باقاعدہ درجات ہیں: متحیّر، مبہوت، مکدّر، مُنقبض، مُتردد، مشوّش، متوحش، مضطرب، محزوں متالّم، بالآخر مُتحجّر یعنی پتھر کا ہو گیا، اب جو کرنا ہے کر لو! ..... کہنے لگے سید صاحب! آپ آسان اُردو میں پریشان نہیں ہو سکتے؟

☆ نفخِ فرہنگ: ڈکشنری، یعنی ثقیل الفاظ کا اپھارا۔ ثقیل غذا کے باعث مویشیوں کی جگالی بند ہو جاتی ہے اور پیٹ پھول جاتا ہے۔ بیشتر اس کی تاب نہ لا کر مر جاتے ہیں لیکن نفخِ فرہنگ میں مبتلا قاموسیے خود نہیں مرتے اوروں کو مار رکھتے ہیں۔

☆ اسی سڑک پر ہمارے ایک مشترک دوست بھی دیکھے جاتے تھے جو اپنے قد سے غیر مطمئن تھے۔ حالانکہ سچ پوچھیے تو قد پر

فخر صرف احمق، اونٹ، زراف، والی بال کے کھلاڑی، رنگروٹ اور کٹی پتنگ لُوٹنے والے ہی کو ہوسکتا ہے۔(۳)

اب ذرا ہمارے اور یوسفی صاحب بلکہ پوری پاکستانی قوم کے محترم جنابِ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی تصویر بھی یوسفی صاحب کے الفاظ ہی میں دیکھیے:

> ''قائدِ اعظم کے چہرے پر جو عزمِ صمیم، ناشکستنی اعتماد اور لہجے میں جو جلالی تیقن اور گھن گرج دیکھی، وہ اس حدِّ کمال تک کہیں اور نظر نہ آئی۔ شخصیت کے جو اوصاف اور چہرے کا جو ایکسپریشن مَیں اپنے پڑھنے والوں کو دکھانا چاہتا ہوں، اس کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ جی چاہتا ہے بس تصویر دکھا دوں۔ سنسکرت میں ان اوصاف کے لیے ایک کھردرا، کھڑکھڑاتا، دھدکتا، بنکارتا، ڈکارتا لیکن جامع و ہمہ صفت موصوف لفظ ہے: دِرِڑھ اور دِرِڑھتا۔ جہاں تک اس کے لغوی معانی و مفاہیم کا تعلق ہے تو ذرا دیکھیے کہ جان ٹی پلیٹس نے اپنی ڈکشنری میں اس کے معنی کیسے مزے مزے لے لے کے، پلٹ پلٹ اور جھوم جھوم کے بیان کیے ہیں۔ معنی کیا بیان کیے ہیں، دھنک اور شبد ساگر کے سارے رنگوں سے بھری پچکاری سے ہولی کھیلی ہے۔ اس لفظ کے صوتی ٹھنا کے اور رڑک سے بھی معنی کے تیور اور تیہا بول اٹھتے ہیں۔''(۴)

دوسرا مضمون ''کیس ہسٹری'' میڈیکل ڈاکٹروں کی تقریب کے موقع پر پیش کیا جانے والا شوخ خطبہ ہے۔ یہ انھی تحریروں میں سے ایک ہے، جسے یوسفی صاحب کی کمزور آئٹم سمجھا جاتا ہے، ذرا اس میں مزاح کے تیور بھی دیکھیے:

☆ جب روپیا اور ڈاکٹر دونوں جواب دے دیں تو ہومیوپیتھی سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔

☆ اب تم جن نظروں سے مسلّم مرغی کو دیکھنے لگے ہو، ویسی نظروں کے لیے تمھاری بیوی برسوں سے ترس رہی ہے۔

☆ قوال خدانخواستہ ڈاکٹر بن جاتے تو اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ قوال حضرات کو کھلی چھوٹ ہے کہ امیر خسرو کے کلام میں داغ دہلوی کے شعر کا پیوند اس طرح لگائیں کہ امیر خسرو اور داغ دہلوی دونوں چھپ جائیں، صرف میرا بائی کا دوہا اور قوال زندہ و پایندہ و گوئندہ رہیں! غالب کے شعر میں اگر سکتہ پڑ جائے تو اسے اجی ہاں!، اللہ! یا برمحل کھانسی اور بے محل واہ سے اس طرح دور کر دیں کہ شاعر کی روح دیکھتی رہ جائے! ڈاکٹر بے چارے کو تو ہر وقت فکر لاحق رہتی ہے کہ مریض مر نہ جائے۔ قوال حضرات اس کا التزام کرتے ہیں کہ کوئی شاعر زندہ نہ بچے!(۵)

''ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے'' یہ باکمال مضمون بیادِ فیض منعقد ہونے والی تین مختلف تقاریب پر پڑھے جانے والے محبت اور مزاح بھرے مضامین، جو بالترتیب ۲۳ نومبر ۱۹۸۴ء کو اُردو مرکز لندن، ۱۲ فروری ۱۹۹۲ء کو

فیض امن میلہ لاہور اور ۲۵ مارچ ۲۰۰۱ء کو آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی میں پڑھے گئے، کا مفصل ملخص ہے۔ شریر ظرافت اور فیض سے ان کی اٹوٹ محبت تحریر کی نس نس سے پھوٹی پڑتی ہے۔ کچھ نمونے ملاحظہ ہوں:

☆ رقص، اُس ساعتِ نایاب میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے جب رقاصہ نظر آنی بند ہو جائے اور صرف رقص نظر آئے، انگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے۔

☆ ہم تو بچپن سے یہی سنتے اور سمجھتے آئے تھے کہ کولھے صرف بیٹھنے، پتلون کو پھسلنے سے باز رکھنے اور سکول میں بَید لگوانے کے لیے بنوائے گئے ہیں، اب تو یہ دیکھا کہ پوری Emotional Range یعنی جذبات کی ساری سرگم کولھوں سے اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ کیا بتائیں، دل پہ چھری سی چل جاتی ہے۔

☆ میرا خیال ہے کہ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے وقت جو شخص اپنے بلڈ پریشر اور گالی پر قابو رکھ سکے وہ یا تو ولی اللہ ہے، یا پھر وہ خود ہی حالاتِ حاضرہ کا ذمہ دار۔

☆ جب کسی لکھنے والے کو پڑھنے میں زیادہ مزا آنے تو جانیے وہ نری حرام خوری پہ اتر آیا ہے۔

☆ تیسری دنیا کے دکھ اور اس کے اسباب وعلل پر فیض کی بڑی گہری نظر تھی۔ تیسری دنیا کا اصل دُکھ بھوک، افلاس اور قحط نہیں ہے۔ تیسری دنیا کا دُکھ قحط الرجال بھی نہیں ہے، جس کا جتنا رونا رویا جاتا ہے۔ تیسری دنیا قحط الرِجال کی نہیں، قہر الرجال کی ماری ہوئی ہے۔

☆ مرد زندگی میں عشق ایک ہی دفعہ کرتا ہے، دوسری مرتبہ عیاشی اور اس کے بعد نری بدمعاشی۔

☆ چار ٹانگوں سے کم کے کسی ذی روح سے ساقی محبت نہیں کر سکتے۔ جب سے انھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ ہم سے محبت کرتے ہیں، ہم راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی ٹانگیں ٹٹول ٹٹول کر گنتے ہیں کہ کہیں ہم اپنے بارے میں کسی مغالطے میں تو مبتلا نہیں ہو رہے ہیں..... نازک مزاج ایسے کہ بور آدمی، خراب شعر اور نیک چلن عورت کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

☆ مجھ جیسے گوشہ نشین نثر نگار کا فیض صاحب کے سامنے شعری محاسن پر گفتگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی بکری کچھار میں جا کر شیر کو Vegetarianism کے فوائد وفضائل پہ لیکچر دے۔

اس عجز کے باوجود شعر کی خصوصیات پہ ان کا انداز ملاحظہ ہو:

> ''فیض کی شاعری کا سارا اعجاز اور اس کی تمام تر پراسرار غم ناکی اور نغمگی، اُن کے منفرد لہجے میں مضمر ہے۔ لہجہ میں بڑے شاعر کی چھب، چھاپ، تِلک اور شناخت ہے۔ لہجہ لفظ کا تیسرا بُعد ہے۔ لہجہ وہ طلسم ہے جس سے خزینۂ تاثیر کا سَم سَم کھلتا ہے اور دنیائے معانی کا درِ دلکشا وا ہوتا ہے۔ یہ لفظ کو نیا مزاج دیتا ہے۔ تازہ توانائی، تیور اور کاٹ بخشتا ہے۔ لہجہ لفظ کا اعتبار ہے۔ لہجہ لفظ کا سمپورن ٹھاٹ ہے۔ یہ زیور نہیں حرف

کی حُرمت اور دمِ عیسیٰ کی حرارت ہے۔ یہ محرمِ رازِ نہاں خانۂ دل ہے۔ لہجہ نیتوں کا امین ہے، لہجہ آدمی کی پہچان ہے، لہجہ خود آدمی ہے۔''(۶)

اس کتاب کا چوتھا مضمون ''انڈس ویلی اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹیکچر'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، کراچی کے ایک تعلیمی ادارے کی سالانہ تقریبات میں دیا جانے والے پُرمغز خطبہ ہے، جس میں حاضرینِ مجلس کو مزے مزے کی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ فنِ مصوری کے حوالے سے نہایت لطیف و شریر تبصرے کیے ہیں۔ دو مثالیں:

☆ مرزا کہتے ہیں کہ بیوروکریٹ کے املا میں 'کریٹ' کی یے کے نیچے دو کی بجائے تین نقطے لگا دیے جائیں تو لفظ منھ سے بولنے بلکہ چغلی کھانے لگے گا۔

☆ اسلام آباد درحقیقت جنت کا نمونہ ہے..... اس اعتبار سے کہ یہاں جو بھی آتا ہے، آدم کی طرح نکالا جاتا ہے۔(۷)

''کلاہِ مریزی'' یوسفی صاحب کے بنوں سے تعلق رکھنے والے ایک بینکر دوست کا دلچسپ خاکہ ہے، جو بڑھاپے میں بھی برگُزیدہ کم اور گزیدہ زیادہ نظر آتے ہیں۔ اتنے دین دار اور پرہیز گار ہیں کہ شدید زکام میں بھی ہر چھینک کے بعد 'الحمدللہ' کہنا نہیں بھولتے اور جو فرماتے ہیں:

☆ پشتو زبان غیرت کی زبان ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ آپ کسی کو برا بھلا کہیں تو جتنا آپ نے کہا ہے، اگلا اس سے بھی زیادہ سمجھ جاتا ہے۔ مَیں نے کراچی کے لوگوں کو اُردو میں گالی دیتے بھی سنا ہے، لگتا ہے بے نمک محاورے بول رہے ہیں۔ دراصل گالی لفظ میں نہیں ہوتی، لہجے میں ہوتی ہے، گالی میں گندگی تو لہجہ بھرتا ہے۔

☆ میرا حُلیہ، جُثّہ، تن نادرستی اور موٹے شیشے والی عینک جھوٹ بولنے یا شیخی بگھارنے میں سخت سے مانع تھی۔

☆ بہترین فکشن آج کل سفرناموں، آٹو بائیوگرافیز اور انکم ٹیکس گوشواروں کی شکل میں لکھا جا رہا ہے۔

☆ رات کو پھل، خصوصاً خربوزہ، ہرگز نہ خریدو اور طوائف کو کبھی نہار منھ نہ دیکھو۔(۸)

''فرمودات فیضی'' یہ مضمون/ خاکہ بھی یوسفی صاحب نے اپنے چار بار وزیر رہ چکے دوست، دوست محمد فیضی کی تقریب میں اظہارِ خیال کرنے کی غرض سے لکھا تھا، جس میں فیضی صاحب کی شخصیت کے مختلف گوشے وا کرتے کرتے وطنِ عزیز کی سیاست، معاشرت کے کئی درشگفتہ انداز میں وا کیے ہیں۔ کچھ نمونے:

☆ ساری عمر غلط قبلے کی طرف سجدہ کرنے سے ملازم پیشہ شخص کے ضمیر پر سیاہ گِلٹا پڑ جاتا ہے، پھر وہ بولتا کم اور تولتا زیادہ ہے۔

☆ بزرگوں کا ادب اور احترام اپنی جگہ لیکن آرٹ اور ادب کی دنیا میں جو عزت فقط اور فقط سنِ پیدائش کی بنا پر کی جائے، وہ عزت کی ذلیل ترین صورت ہے۔

☆ مَیں نے کسی دانا کا قول پڑھا ہے کہ اگر تم کسی شخص کو دوڑ دوڑ کے بیوی کے لیے کار کا دروازہ کھولتے دیکھو تو اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں: یا تو کار نئی ہے، یا پھر بیوی نئی ہے۔ (۹)

''لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز''لمز یونیورسٹی کے سالانہ جلسۂ عطائے سند کے موقع پر دیا گیا خطبہ ہے، جس میں وہ اس عظیم درس گاہ کے طلبہ سے دلچسپ انداز میں خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

☆ کتابی علم جب تک تجربے کی کٹھالی میں گل، پگھل اور ڈھل ڈھلا کر حقائقِ حاضرہ کے ساتھ یک رنگ و ہم رنگِ یک دگر نہ ہو جائے، وہ صحیح معنوں میں نافع یعنی کارآمد، کارکُشا و کارآفریں نہیں ہوسکتا.....زندگی ہر مرحلے، ہر موڑ اور ہر قدم پر تازہ کاری، محبت، جفاکشی اور استقامت کا مطالبہ کرتی ہے۔ محنت کا اب تک ایک ہی شارٹ کٹ دریافت ہوا ہے: اور زیادہ، اور زیادہ محنت۔

☆ انگریزی کی بہ نسبت اُردو میں بظاہر ایک ہی خرابی نظر آتی ہے، وہ یہ کہ آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی کی مادری زبان کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ گانا، گنتی، گلہ گزاری اور گالی اپنی ہی زبان میں مزہ دیتی ہے۔

☆ ایک انگریز بینکر کا کہنا ہے کہ ۳ پائی کی غلطی ۳ ملین کی غلطی سے زیادہ ذلیل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس سے غلطی پن کے علاوہ غلطی کرنے والے کی کم ہمتی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ (۱۰)

''نیرنگِ فرہنگ'' جناب مشتاق احمد یوسفی کے یارِ طرح دار، معروف شاعر اور لغت نویس جناب شان الحق حقی کی شخصیت اور لغت نویسی کے فن کا نہایت شریر اور دل آویز مرقع ہے۔ شان الحق حقی جن کی بابت یوسفی صاحب کا خیال ہے کہ وہ ہر لغزش، ہر گناہ معاف کر سکتے ہیں، سوائے غلط تلفظ، غلط املا اور غلط روزمرہ کے۔ وہ غلط آدمی اور برخود غلط خاتون کو کچھ نہیں کہتے لیکن تذکیر و تانیث پر اچھے اچھوں کو ڈانٹ دیتے ہیں۔ یوسفی ہی کے بقول حقی صاحب دُھن کے پکے اور منکسر المزاج شاعر، ادیب اور عالم ہیں۔ ورنہ ہمارے ہاں جیّد عالموں، نقادوں اور دانشوروں کی کمر نہیں اکڑتی، گردن اکڑتی ہے اور ایسی اکڑتی ہے کہ زمین نظر نہیں آتی۔ سر کبھی تعظیماً جھکتا بھی ہے تو آئینے کے سامنے اپنے ہی حضور! حقی صاحب کی لفظ شناسی سے متعلق وہ لکھتے ہیں:

☆ وہ لفظ کے رسیا، مزاج داں، بیّاض، فصّاد، اُس کے راز ہائے دروں کے محرم، نگینہ ساز، محک، پارکھ، جوہری، تراشندہ و نگارندہ سبھی کچھ ہیں۔

لفظ کی اس مزاج داری کا ثبوت ذرا اس سوال کے جواب میں ملاحظہ کیجیے، جو ایک انٹرویو لینے والے نے حقی صاحب سے پوچھا:

☆ پوچھا: آپ کے سر پر تو ماشا اللہ اب بھی اتنے بال ہیں کہ یوسفی صاحب اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی سرپوشی کے بعد بھی ڈھیر سارے بال بچ رہیں گے، جن سے 'جنگ' اخبار کے ایڈیٹر محمود شام کے لیے ایک گھُنگر الا وِگ بنایا جا سکتا ہے، پھر

آپ نے یہ بھٹو صاحب جیسی چھجے دار ٹوپی پہننی کیوں شروع کر دی؟

خفیف سی مسکراہٹ کے بعد فرمایا: معاف کیجیے، ٹوپی پہنی نہیں جاتی، اوڑھی جاتی ہے۔ شلوار، شلوکا، خود اور زرہ بکتر پہنے جاتے ہے، لنگوٹ کسا جاتا ہے، لنگوٹی، تہمد اور ارادہ باندھے جاتے ہے۔ تاج سر پر رکھا جاتا ہے، نوٹ نیفے میں اُڑسا جاتا ہے، فوجی وردی اور نئے فیشن کے سوٹ ڈانٹے جاتے ہیں۔ لڑکیاں بالیاں عید پر زرق برق پوشاکوں میں مُلبّس ہوتی ہیں، آپ سمجھ رہے ہیں نا؟(۱۱)

اس کتاب کا نواں مضمون ''مہرِ دونیم'' یوسفی جی کے لندن کی محفلوں کے ساتھی اور معتبر شاعر جناب افتخار عارف کا شخصی خاکہ اور ان کی دل فریب شاعری کا دل بہار محاکمہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فیض کی طرح افتخار عارف کو بھی اپنے موقف، آہنگِ اضافت اور لہجے پر پورا اعتماد ہے، وہ ان کے لہجے کی بابت مزید کیا لکھتے ہیں، اس اقتباس میں ملاحظہ فرمایئے:

> ''ان کے ہاں الفاظ ہی کا شکوہ نہیں، لہجے کا شکوہ بھی ہے۔ شِکوہ بھی کرتے ہیں تو تو لہجے کے شکوہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لہجہ لفظ کو نئی توانائی، گیرائی اور رنگ و آہنگ بخشتا ہے۔''

پھر ذرا یوسفی جی کا یہ کمال بھی دیکھیے کہ افتخار عارف کی پسند ناپسند، ذوق، ترجیحات اور طرزِ زیست کو کس طرح ایک ہی جملے میں بیان کر دیا ہے:

> ''وہ خراب شعر، منمنا تا ترنم، صحیح سائز کی قمیص، شوربے کا سالن اور ٹھنڈا کباب برداشت نہیں کر سکتے۔ خراب شعر اور نثری نظم کہنے والوں کے بارے میں ان کا عقیدہ ہے کہ ان کی نمازِ جنازہ حرام ہے۔''(۱۲)

''چادر، چاند بی بی اور کالم بھر چاندنی'' افسانہ نگار، ناول نگار، کالم نگار اور سیاست دان بشریٰ رحمٰن کی تقریب میں پڑھا گیا لطیف و شریر مضمون ہے ذ۔ وہ بشریٰ رحمٰن کی افسانہ نگاری کی اوٹ میں چھپ جانے والی مختلف حیثیات کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''اگر کوئی لکھنے والی ایک بار ''خاتون افسانہ نگار'' کی حیثیت سے متعارف اور مشہور ہو جائے تو پھر یہ چپکو اں لیبل چھُٹائے نہیں چھُٹے گا۔ اس کے فن پر جو ہنر پوش شٹل کاک بُرقع مردوں نے ایک دفعہ ڈال دیا، اُس کا نقاب اگر روزمرہ استعمال یا کثرتِ رونمائی سے جھیر جھیر اور لیر لیر ہو جائے اور وہ خاتون سرجیکل آپریشن سے جنس تبدیل کروا کے میری ہم جنس اور، نظرِ بد دور، میری ہم شکل لگنے لگے، یا اس کے مولانا ایدھی جیسی چھاجائل داڑھی یا پروفیسر پریشان خٹک جیسی شباب آلود مونچھیں نکل آئیں، تب بھی

لوگ اُس دُکھیا کو سابق خاتون افسانہ نگار ہی کے نام و لقب سے پکاریں گے.....
بشریٰ رحمٰن کی طرح لکھنے کے لیے دو الیکشنوں اور چار زچگیوں سے گزرنا اور میاں عبدالرحمٰن کی زوجیت میں ہونا اَز بس ضروری ہے، جس سے کم از کم مَیں قاصر ہوں۔''(۱۳)

''یادِ یارِ طرح دار'' جنابِ یوسفی کے علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی کے بے تکلف اور بے پناہ دوست جناب ابنِ حسن برنی کا لطیف ولذیز مرقع ہے۔ اس خاکے کا شمار اس کتاب کی بہترین تحریروں میں ہوتا ہے۔ یوسفی جی کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ سچی، گہری، پائیدار اور قابلِ اعتبار دوستی کی بنیاد درحقیقت ناسمجھی، بے خبری اور ناتجربہ کاری کی عمر ہی میں پڑتی ہے۔ برنی صاحب جنھیں شاعروں، ادیبوں کے ناز اٹھانے میں مزہ آتا تھا۔ یوسفی جی نے ان کی گفتگو کو 'چسکے دار' قرار دیا ہے، جو بالعموم گھٹا ٹوپ فلسفے، طنز و استہزا اور حاشیہ آرائی سے پاک ہوتی۔ یوسفی صاحب کے علاوہ ان کے حلقۂ احباب میں قدرت اللہ شہاب، شیخ منظور الٰہی، نورالحسن جعفری، قرۃالعین حیدر، جمیل الدین عالی، سید حامد اور ایک وہ بزرگ جنھیں وہ 'دھاڑ دھاڑ شاہ' کہتے تھے، نمایاں تھے۔ اس خاکے سے چند جملے دیکھیے:

☆ مرزا کہتے ہیں کہ جو شخص روزانہ رغبت سے بدمزہ کھانا کھائے یا کسی بدصورت پہ جی جان سے عاشق ہو جائے، اُس سے ڈرنا چاہیے۔ ایسے سے کچھ بھی بعید نہیں!

☆ حاسدوں اور پیچھے رہ جانے والوں کی زبان، ان کی ٹانگوں سے زیادہ چلتی ہے۔

☆ برنی صاحب کا یہ موقف تھا کہ اس حُلیے بُشرے کا آدمی غبن کر ہی نہیں سکتا، غبن کے ارتکاب کے لیے تو ذہانت درکار ہوتی ہے۔(۱۴)

''آم، روہو اور بچھو'' ایک مختصر سا مضمون ہے، جس میں امروہہ سے وابستہ، شعرا و ادبا اور دیگر نسبتوں کا طنزیہ و مزاحیہ انداز میں تذکرہ ہے۔ اس کے ساتھ ''سدِ سمندری'' اس مجموعے کے بہترین مضامین میں شمار کیا جانا چاہیے، جس میں کراچی کے ساحلِ سمندر پر واقع بستیوں اور لوگوں سے متعلق حکومتوں اور بالخصوص آمرانہ رویوں کی خوب خبر لی گئی ہے۔ یہ مضمون اس طرح کی پیروڈیوں سے بھی بھرا پڑا ہے۔

☆ انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے تاج

☆ مزاجِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقریریں

☆ وہی وعدہ یعنی نکاح کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

☆ آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ فرار

☆ تو برائے غسل کردن آمدی نہ برائے وصل کردن آمدی

پھر اسی مضمون سے یہ جملے بھی ملاحظہ کیجیے:

☆ مَیں اکثر کہتا ہوں کہ مصنف کو صرف کتاب کے آئینے میں دیکھنا چاہیے۔ اُس کے اور قاری کے درمیان ایک محتاط فاصلہ یعنی کتاب بھر کا فاصلہ بہت ضروری ہے، اور اگر قاری یا قَین کوئی خاتون ہے تو اُس کے اور مصنف کے درمیان شوہر بھر کا فاصلہ رہنا چاہیے۔

☆ ٹونٹی کا کام تو لوٹے کو کفایت شعاری سکھانا ہے۔

☆ مرزا کہتے ہیں کہ ایسی آب و ہوا اور حالات میں صرف تاجر، مہاجر، مچھر اور مگر مچھ ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ (۱۵)

اگر کہا جائے کہ معروف مزاح نگار سید ضمیر جعفری کی انوکھی شخصیت و نرالے مزاج سے متعلق لکھا گیا ''ضمیرِ واحد متبسم'' اس کتاب کا لاجواب اور بے مثل خاکہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ یوسفی صاحب کے بے تکلف دوست میاں فضل حسن کے ہاں جمنے والی محفلوں کا رنگین و نمکین تذکرہ بھی ہے۔ میاں فضل حسن، جن کے والد حاجی صاحب نہایت مرنجاں مرنج اور جہاں دیدہ قسم کی شخصیت ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کے دوستوں پر گہری نظر رکھتے۔ وہ یوسفی صاحب کو ان کی قلیل تنخواہ، پیر الٰہی بخش کالونی میں غریبانہ رہائش، خراب صحت اور جوتوں کپڑوں سمیت ۱۲۰ پونڈ وزن کی بنا پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے کہ ان کا خیال تھا، اس قماش کے آدمی میں بدچلنی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ وہ بیٹے کو نصیحت کرتے کہ جو شخص بہت اچھا اور قیمتی لباس پہن کر، یا دھوپ کی عینک لگا کر آئے، یا بزنس ڈیل کے دوران شعر پڑھ دے، یا بے وجہ بہت اخلاق و انکسار سے پیش آئے، اُسے ادھار پر مال ہرگز نہ بیچو۔

اسی طرح سید ضمیر جعفری کہ جن کے متعلق مصنف کا خیال ہے کہ وہ پہلے فوجی تھے جس نے اپنی درویشی چھپانے کے لیے یونیفارم پہنی۔ ضمیر جعفری کہ جنھیں بات سے بات نکالنے کا ہنر آتا تھا اور جن کی موجودگی میں کمرے کی ہر دیوار دیوارِ قہقہہ بن جاتی۔ وہ ہر ایک کے ہم عمر بن جاتے۔ ہر کسی سے جھک کے ملتے لیکن پچکتے کسی سے نہیں تھے۔ وہ مصافحے میں بھی معانقے کی سی اپنائیت اور محبتیں بھر دیتے تھے بلکہ ٹیلی فون پر بھی ایسی ہمکتی چھلکتی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے کہ لگتا 'جپھی' ڈال دی ہو۔ اس کھلکھلاتی تحریر سے چند جملے:

☆ مَیں نے پوچھا: ضمیر بھائی! کبھی داڑھی رکھنے کا خیال آتا ہے؟ بولے: کیوں نہیں! دشمنوں نے بارہا Suggest کیا مگر پہلے ہی اوور ویٹ ہوں، میرے گھٹنے مزید بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔

☆ مصافحہ بہت چغل خور ہوتا ہے، ہاتھ ملانے کے انداز ہی سے دونوں کے اخلاق و انکسار، مزاج و منصب، تمکنت و طنطنہ، ملنساری اور سنابری کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

☆ انسان کے مصائب کی تمام تر ذمہ داری خود انسان ہی پر عائد ہوتی ہے جو آپ اپنا مسبب المصائب ہے۔

☆ ایک اُمی شاعر ہو گزرے ہیں جو وَرتخلص کرتے تھے۔ ایک محفل میں تازہ غزل سنا رہے تھے کہ ایک شاگرد

نے بآوازِ بلند پوچھا کہ استاد! اس شعر کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا: شعر سنو، معنی ابھی نہیں ڈالے ہیں۔

☆ میرے خیال میں بڈھے عاشق میں تین خوبیاں ایسی ہوتی ہیں، جو کسی جوان میں ہو ہی نہیں سکتیں۔ اوّل: بے ضرر و بے طلب ہوتا ہے۔ دوم: با وفا ہوتا ہے۔ سوم: جانتے بوجھتے جس شدت اور یکسوئی سے وہ باؤلا ہوتا ہے وہ کسی جوان کے بس کا روگ نہیں..... ضمیر جعفری بولے: چوتھی خوبی تو آپ بھول ہی گئے، جلدی مر جاتا ہے۔ (۱۶)

''مسندِ صدارت پر اولتی کی ٹپاٹپ'' مختلف ادوار میں انعقاد پذیر ہونے والے چار عدد مشاعروں کے تجربۂ صدارت کی شرارت آمیز بلکہ تڑپتی تڑپاتی، بھڑکتی بھڑکاتی رُوداد ہے۔ انداز دیکھیے:

☆ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میر، سودا اور غالب کبھی مسندِ صدارت پر متمکن رہے ہوں۔ ہاں! مفتی صدر الدین آزردہ جو کمزور شعر کہنے پر بھی قدرتِ کاملہ رکھتے تھے، بارہا میرِ مشاعر بنے۔ اُس زمانے میں شعرا نثر کا استعمال صرف داد دینے اور ایک دوسرے کے کلام میں زبان و عروض کی غلطیاں نکالنے کے لیے کرتے تھے۔

☆ اُردو غزل کی بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں گھٹیا آدمی، بڑے بڑھیا شعر نکال سکتا ہے۔

☆ حملہ کرنے کے لیے حق پر ہونا ضروری نہیں، حملہ آور کے تیور، ہتھیار اور پینتروں پر نظر رکھنی چاہیے۔ (۱۷)

''شاہ جی کی کہانی، دوسرے شاہ جی کی زبانی'' جنگ گروپ سے وابستہ معروف صحافی، مدیر اور مصنف شفیع عقیل المعروف ش۔ ع کی تقریبِ اعزاز میں پڑھا جانے والا صدارتی خطبہ ہے۔ صرف تین مثالیں:

☆ کٹھن زندگی، اور کٹھور زمانے سے بہتر و برتر کوئی استاد اور گُرو نہیں۔

☆ واضح ہو کہ مفارقت کی سب سے عام، ظالم دائمی اور باؤلی صورت وہ ہے جو بغیر قُربت کے واقع ہو، یعنی یک طرفہ فریفتگی اور چاہت۔

☆ صحافی ہو یا سیاست داں، جج ہو یا بیوروکریٹ، یہ سب اسی ترکیب سے پکڑائی دیتے ہیں، جس سے بعض علاقوں میں بندر پکڑے جاتے ہیں۔ (۱۸)

اس کتاب کی ایک پُرکمال اور شگفتہ تحریر ''الطاف گوہر اور گُڑ کی ڈلی'' ہے، جس میں یوسفی کا فن بلندیوں پہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ طنز و ظرافت، اعلیٰ ترین نثر اور لطیف و ظریف اسلوب سے تر تر اتا مضمون ہے۔ اس میں کئی شعرا، ادبا کا پیار، دُلار اور خمار بھرا تذکرہ ہے۔ یوسفی جی کے مرغوب موضوعات، آمریت اور بیوروکریسی پر شوخ تبصرے ہیں، حتیٰ کہ الطاف گوہر کو بھی نہیں بخشا۔ یوسفی صاحب اور آغا حسن عابدی کی کاوشوں سے وجود پانے والے اُردو مرکز لندن سے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی کی آپ بیتی میں پائی جانے والی خود ستائی و دروغ گوئی کی بھی خوب خبر لی ہے۔ چند اقتباسات:

☆ ان کے ایک ماتحت کا بیان ہے کہ عبارت خود بڑے صاب سے غلط جگہ پر سیمی کولن لگوا کر متفخر محسوس کرتی ہے۔

☆ ناکام آدمی کی غیبت میں کوئی بھی وقت ضایع نہیں کرتا۔

☆ ڈاکٹر عبادت بریلوی یہ بتانے کی زحمت فرمائیں گے کہ اس کی رقم کس نے وصول کی؟ یا اس کا حشر بھی وہی ہوا، جس کا ذکر 'میرا لونگ گواچا' اور 'جھمکا گرا رے بریلی کے بازار میں' آتا ہے۔

☆ جس کا جنسی تجربہ جتنا کم ہوگا اور جنسی محرومی و نا آسودگی جتنی زیادہ ہوگی، وہ فحش نگاری میں اتنا ہی زیادہ کھل کھیلے گا۔

☆ یادش بخیر، مخدومی مولانا کوثر نیازی کے دورِ وزارت پُرخطابت میں جب پری چہرہ تصور خانم ان کا کلام پکے راگ میں گانے کی کوشش کرتی تھی، تو نہ کلام سمجھ میں آتا تھا نہ راگ، بس چہرہ سمجھ میں آتا تھا...... جب وہ حسینہ ٹی وی پر اپنے مخصوص سیکسی انداز سے ناک سکیڑتی تو بس جان ہی تو نکل جاتی تھی! میرا مطلب ہے مولانا کے کلام کی...... یہ پہلی فن کارہ ہے جس نے ناک کو سیکس کے برملا اظہار و انگیخت کے لیے اور بطور آلۂ تسخیرِ مردانِ خوش اوقات، پہلے پہل استعمال کیا۔ بلا شبہ یہ پہلی ستر ناک ہے، جس پر غلاف اور پردہ واجب ہیں۔ (۱۹)

''یہاں کچھ پھول رکھے ہیں'' کراچی کی شاعرہ شاہدہ حسن کے بارے میں تقریباتی مضمون ہے، جس میں شاعرات کے فیمینزم کا موازنہ یوسفی کے شریر قلم سے ملاحظہ ہو:

☆ شاہدہ کے ہاں وہ وصف تو ہے جسے اب نسائی حِسیّت سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن جارحانہ فیمینزم کا شائبہ نہیں۔ نسائی حِسیّت اور فیمینزم کو اس منزل تک آنے میں کئی صبر و مرد آزما مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ادا جعفری کی دل آویز حسرت دیکھیے:

ہونٹوں پہ کبھی اُن کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی بر سرِ اِلزام ہی آئے

پھر اس کا موازنہ فہمیدہ ریاض کے بوسے سے کیجیے، جس کے دوران یوں محسوس ہوتا ہے جیسے: 'تم بوسۂ پاتال سے میری جان کھینچتے ہو' ہونٹوں پر نام آئے سے، پیار کی پاتال کہرائیوں تک اترنے میں دو نسلوں اور نہ جانے کتنی ذہنی صدیوں اور موروثی inhibitions کا فاصلہ ہے۔ یہ جوگ بیراگ اور جنم جنم کی پیاس سے بھوگ بلاس تک کا سفر ہے۔ اسی سفرِ پُرخطر میں ایک اور جرأت مند شاعرہ محوِ خرام نظر آتی ہے جو سب کچھ چھپا کر، سب کچھ دکھا دینے کا ہنر سیکھ رہی ہے:

مَیں یہ بھی چاہتی ہوں ترا گھر بسا رہے
اور یہ بھی چاہتی ہوں کہ تو اپنے گھر نہ جائے

''مرزا کب چُوکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ خواہش تو تمھارے رومینٹک ویجیٹیرزم کی مانند ہے۔ تم دراصل یہ چاہتے ہو کہ جس مرغے کا روسٹ تم شام کو کھاؤ، وہی مُرغا صبح اُٹھ کر اذان بھی دے۔'' (۲۰)

اسی طرح ''میں اختتام ہوں اِک عہد کے فسانے کا'' بھی کراچی ہی کے ایک شاعر نظر امروہوی کی شخصیت اور فن پر شستہ اور شگفتہ اظہارِ خیال ہے۔ نظر امروہوی مشاعرے کے شاعر تھے۔ بقول یوسفی ان کی دراز قامتی فوجیوں جیسی، شیروانی علی گڑھ کے طالب علموں والی، جذبات جوانوں کے اور حلیہ بزرگوں کا سا بنائے رکھتے ہیں، جب کہ باتیں نوجوانوں، ہنسی اور حرکتیں بچوں کی سی رکھتے ہیں۔ دو اقتباسات دیکھیے، جن میں حِسِ مزاح کے لوازمات بھی بیان ہو گئے ہیں:

☆ حِسِ مزاح کی کاٹ اور تاب و تواں کا اولیں تقاضا یہ ہے کہ آدمی خود پر دوسروں کو ہنسانے کے ہنر سے واقف ہو۔ یہ سعادت وصلاحیت جتنی خداداد و وہبی ہے، اُس سے کہیں زیادہ انکسار و خود شکنی کی متقاضی ہے۔

☆ یک طرفہ محبت میں دو بڑے فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں ناکامی کا اندیشہ نہیں، دوسرا یہ کہ اس کا دورانیہ کسی دوسرے کی مرضی پر منحصر نہیں۔ (۲۱)

''پلکوں سے پینٹ کرنے والا مصور'' بھی کراچی ہی کے ایک مشکل نام والے مصور شاہد رسّام کے فنِ مصوری پر یوسفی برانڈ ہی کا شوخ تبصرہ ہے۔ چند نمونے دیکھیے:

☆ اچھی تقریر کی تین شرائط ہیں: سچ بولو، بولنے سے پہلے تولو، بیٹھ جاؤ، قبل اِس کے کہ بٹھا دیے جاؤ۔

☆ تصویر دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آرٹسٹ نے گھوڑے کو کیمرے کی آنکھ سے نہیں دیکھا، گھوڑی کی آنکھ سے دیکھا ہے۔

☆ بعض آرٹسٹ اور افسانہ نگار جب طوائف اور اس کی شبوں کے گداز اور درگت کی تصویر کھینچتے ہیں تو قلم اور موقلم کو پینٹ اور روشنائی کے بجائے رال میں ڈبو کر قرطاس و کینوس پر رکھتے ہیں۔ (۲۲)

''قصہ خوانی بازار سے کوچۂ ماضی گیراں تک'' اٹھتر صفحات پر مشتمل یہ اس مجموعے کی آخری اور طویل ترین تحریر ہے جو پشاور میں مختلف زمانوں میں منعقد ہونے والی متعدد تقاریب کی رنگا رنگ یادوں کی خوش کُن لفظی تصویر کشی ہے۔ اسے ہم یوسفی جی کی محبِ خاص، یوسفی شناس اور پشاور یونیورسٹی شعبۂ اُردو کی چیئر پرسن ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں کا ایسا خاکہ بھی کہہ سکتے ہیں، جس میں یوسفی صاحب نے حسبِ عادت و ماضی دیگر بہت سے واقعات اور شخصیات سے وابستہ یادوں، دل دادوں اور ارادوں کو سمیٹ لیا ہے۔ چند اقتباسات:

☆ مسکراہٹ سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔ مسکراہٹ وہ معنی بھی ذہن نشین کرا دیتی ہے جو متن میں نہیں ہوتے۔

☆ لڑکی نے گھنے سنہری بالوں والا سر ہلاتے ہوئے کہا: ''وائن تو بڈھوں اور حاملہ عورتوں کا ڈرنک ہے۔'' مَیں نے دل ہی دل میں اُس کا آسان اردو میں ترجمہ کیا: چچاؤں اور زچاؤں کی چُسکی اور اَچھوانی ہے۔

☆ بارہ مسالے: ۱۔ زیرہ سفید، ۲۔ زیرہ سیاہ، ۳۔ پودینہ، ۴۔ الائچی، ۵۔ مرچ سیاہ، ۶۔ سونف، ۷۔ نمک، ۸۔ دھنیا، ۹۔ ہلدی، ۱۰۔ ادرک، ۱۱۔ کلونجی، ۱۲۔ اجوائن..... قابلِ غور بات یہ ہے کہ پزا، نوڈلز، میکڈونلڈ کے برگر اور کے ایف سی

کے چکن میں، اِن بارہ مسالوں میں سے صرف نمک استعمال ہوتا ہے! پھر بقول مرزا، نئی اور پرانی نسل کا قارورہ ملے تو کیونکر ملے!

☆ ہنسی کی دو سے زیادہ قسمیں، سات سے زیادہ سُر، ان گنت استھائی اور بے انت انترے ہوتے ہیں۔ موقع ومحل، روزِ ابر وشبِ ماہتاب کی قید نہیں۔ ہنسنے والا بات بے بات ہنسے چلا جاتا ہے۔ پھر جب دنیا کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتی ہے تو نہ ہنسی آتی ہے نہ رونا۔

☆ ایک چینی کہاوت ہے کہ ایسے شخص سے بچ کے رہو، جس کا پیٹ ہنسنے میں نہیں ہلتا۔

☆ جو عورت چھپکلی سے بھی نہ ڈرے، اُس سے ڈرنا چاہیے۔

☆ مرزا کہتے ہیں کہ سیکس سے اگر لطف و لذت اور اچنبھے کا عنصر خارج کر دیں تو جو کچھ بچ رہے گا، اسے شرفا اور راضی برضائے اہلیہ رہنے والے شوہر وظیفۂ زوجیت کہتے ہیں۔

☆ وہ مجھے ہر بار ٹوکتے تھے کہ صحیح لفظ 'قمیص' ہے۔ ص پر نقطہ درزیوں اور انگریزوں نے لگایا ہے۔

☆ مدت العمر سے شدت العمر میں مبتلا ہوں۔

☆ داغ ہے بانکا اور البیلا شاعر! مگر مظلوم ان معنوں میں کہ اس کے دامن کو طوائفوں نے، شاعری کو نقالوں اور شہرت کو نقادوں نے داغ دار کر کے چھوڑا۔ (۲۳)

کتاب پڑھنے کے بعد ہم تو ابھی اس کے نشے کے پورے جسم اور حواس پہ طاری ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ کراچی کے جناب خرم سہیل نے اس کتاب کی بابت نہایت غصے میں ایک تحریر لکھ ڈالی، جس میں وہ فرماتے ہیں:

> ''اس کتاب کی اشاعت میں ایک بہت بنیادی علمی غلطی ہے، وہ یہ کہ مصنف کی تقریروں کو جمع کر کے مرتب کی گئی کتاب کو مصنف کی تازہ تصنیف کے طور پر پیش کر دیا گیا، اس کتاب میں زیادہ تر وہ تقریریں ہیں، جو انھوں نے مختلف مواقع پر کیں۔ ان تقریروں یا تحریروں کو، جنھیں اس کتاب کا حصہ بنایا گیا، مشتاق احمد یوسفی نے اتنا معیاری نہیں سمجھا تھا کہ وہ شائع ہوسکیں لیکن کراچی آرٹس کونسل کی انتظامیہ کو نہ جانے بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ انھوں نے یوسفی صاحب کے اہلِ خانہ کی مدد سے اس کی اسٹڈی ٹیبل کی ڈسٹ بن کو کھنگال کر ایک کتاب بنا ڈالی..... یہ اور شرم ناک بات ہے کہ اس شخص کے نام سے کتاب شائع کر دی جائے، جس نے وہ کتاب لکھی نہیں۔ اصولی طور پر تو جس نے اس کتاب کو مرتب کیا، اس کا نام دیا جاتا اور یہ بتایا جاتا کہ یہ تحریریں یوسفی صاحب کی اتنی پرانی ہیں، تو شاید کچھ بات بن جاتی لیکن خوشامد اور

مفاد پرستی کی ریوڑیاں بانٹنے والے یہ کیا جانیں؟''(۲۴)

خرم سہیل کے اس غصے کو ہم آسانی سے مزاح کے ایک مستند قاری کی جناب یوسفی سے محبت بھی قرار دے سکتے تھے لیکن ہمارے اس لائی لگ معاشرے میں نقصان یہ ہوا کہ ادبی دنیا میں اس رائے سے ملتا جلتا ایک بیانیہ تشکیل پاتا گیا۔ لوگوں نے کتاب پڑھے بغیر ہی، یا پڑھنے سے پیشتر ہی ایک ذہن بنا لیا کہ یوسفی صاحب کے گھر والوں کی بے احتیاطی، پبلشروں کی بے صبری یا یوسفی صاحب کی بے خبری ہی میں یہ کتاب چھاپ ڈالی گئی ہے، حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہوا۔ کتاب کو یوسفی صاحب کی ''اسٹڈی ٹیبل کی ڈسٹ بِن'' قرار دینا بھی بہت بڑی زیادتی ہے۔ ''یہ اور شرم ناک بات ہے کہ اس شخص کے نام سے ایک شائع کر دی جائے، جس نے وہ کتاب لکھی نہیں۔'' ہٹ دھرمی، لاعلمی اور نہ جانے کس کس کے ساتھ بغض کی انتہا ہے۔ جہاں تک اس کتاب کے ادبی معیار کا تعلق ہے تو حق بات یہ ہے کہ یہ یوسفی صاحب کی دیگر تحریروں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ یہ کتاب نہ چھپتی تو ہم یو یقیناً ایک اہم ادبی متاع سے محروم رہ جاتے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس میں شامل چند تحریریں ایسی بھی ہیں، جو عجلت میں یا فرمائشی طور پر لکھی گئی ہیں، جن کے بغیر بھی یہ کتاب مکمل تھی۔ لیکن اگر ہم طنز و مزاح کی باقی دنیا پہ نظر ڈالیں تو کس کے ہاں ایسا معیار ہے، جس سے یہ تحریریں کم تر ہیں؟ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ چند تحریریں یوسفی کے اعلیٰ معیار پہ پورا نہیں اترتیں یا یوسفی صاحب کو انھیں 'پال سے نکال کے' تراشنے، اجالنے، سنبھالنے کا موقع نہیں مل سکا لیکن ان کو بنیاد بنا کے پوری کتاب کو ردی کا مال قرار دے ڈالنا سراسر زیادتی ہے۔

ہاں! اس کتاب میں چند باتیں ایسی ہوئی ہیں جن کو یوسفی صاحب کے حوالے سے خلافِ معمول قرار دیا جا سکتا ہے۔ پہلی بات یہ کہ یوسفی صاحب اپنی ہر کتاب کا نہایت زندہ اور شگفتہ دیباچہ تحریر کیا کرتے تھے، جو بعض اوقات ان کی دیگر تحریروں سے بھی زیادہ لذیذ ہوتا تھا، وہ اس کتاب میں موجود نہیں..... قبل ازیں یوسفی صاحب کے ہاں ہر مجموعے میں انتساب کی رسم بھی نہایت سلیقے سے ادا ہوتی رہی ہے، جو یہاں دکھائی نہیں دی..... تیسرے یہ کہ جنابِ یوسفی کی کتاب میں املا یا پروف کی غلطی کا امکان گدھے کے سر پہ سینگوں سے بھی کم ہوتا تھا، لیکن یہاں املا اور پروف کی تریسٹھ اغلاط کو تو خود ہم نے نشان زد کر رکھا ہے..... چوتھے یہ کہ یوسفی صاحب کے ہاں املا کا معیار اول تا آخر ایک سا ہوتا تھا، لیکن یہاں متعدد مقامات پر دلھا اور دلہا، چھ اور چھے، پی ایچ ڈی اور پی ایچ۔ڈی جیسے الفاظ الگ الگ انداز میں لکھے گئے ہیں، لیکن ان باتوں سے بھی کتاب کے علمی و ادبی معیار میں فی نہیں ڈالی جا سکتی۔ اس کی سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ 'چراغ تلے' کی اشاعت کے وقت جس یوسفی کی عمر چالیس سال اور 'آبِ گم' کے طبع ہوتے وقت انہتر برس تھی، 'شامِ شعر یاراں' تک آتے آتے ان کی عمر ترانوے کے ہندسے کو عبور کر چکی تھی۔ جس باریک بینی اور ریزہ چینی کا مظاہرہ وہ جوانی حتیٰ کہ ادھیڑ عمر میں کرتے رہے ہیں، اس کی توقع ایک صدی کے آدمی سے نہیں کی جا سکتی اور مرتبین یا پبلشر سے ایسی عرق ریزی تو کسی طرح ممکن نہیں۔ گھر والے کسی ادیب کے بھی معیار کی اس انتہا پہ نہیں ہوتے۔ مجھے یہ تو علم ہو گیا تھا کہ یوسفی صاحب کی صحت کے مسائل کی بنا پر اس کتاب کے

دیباچے، انتساب اور املا کے معاملات حسبِ سابق نہ نبھائے جا سکے۔ اس کے باوجود مَیں نے کتاب کے مطالعے کے بعد نامراد دل کی تسلّی کی خاطر یوسفی صاحب کو جنوری ۲۰۱۵ء میں فون کیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد عرض کیا: آپ کی نئی کتاب آ گئی ہے، اس کی بابت کچھ فرمایئے؟

جی ہاں! کتاب آ گئی ہے، آپ نے پڑھی؟

بالکل پڑھی!

آپ کو کیسی لگی؟

مجھے تو بہت پسند آئی!

چلیں اگر آپ کو پسند آ گئی ہے، تو ٹھیک ہے۔

کتاب سے متعلق اس مختصر سی گفتگو کے باوجود مَیں کسی حد تک گومگو میں رہا۔ رہی بات کتاب کی اشاعت میں یوسفی صاحب کی رضا مندی کی تو اب اس کی اصل حقیقت بھی سن لیجیے کہ ۲۰۱۵ء ہی میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے چیئرمین ڈاکٹر انعام الحق جاوید کراچی گئے اور بالاصرار یوسفی صاحب سے ان کی پانچوں کتابوں میں سے ایک جامع انتخاب شائع کرنے کی منظوری لینے میں کامیاب ہو گئے۔ میری خوش قسمتی کہ یوسفی صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی متفقہ آرا سے انتخاب کا قرعہ میرے نام پڑا۔ اس تخصص سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مَیں نے این بی ایف کے تجویز کردہ روایتی نام ''منتخب مضامینِ یوسفی'' کو قوسین میں رکھ کے کتاب کو ''عالَم میں انتخاب'' کا عنوان دیا، جسے منظور کر لیا گیا۔ انتخاب عمل میں آ گیا، کمپوزنگ ہو گئی، پروف پڑھے گئے، دیباچے میں ''شامِ شعرِ یاراں'' کا ذکر کرتے ہوئے مَیں نے سنی سنائی باتوں میں آ کے لکھ دیا کہ یہ مجموعہ یوسفی صاحب کی نیم رضا مندی سے شائع ہوا۔ مسودہ جب حتمی ملاحظے کے لیے کراچی گیا تو کتاب میں شامل مضامین کے انتخاب کو تو سراہا گیا لیکن ان کے اہلِ خانہ کو چند اور امور کے ساتھ ساتھ دیباچے میں مذکور یہ بات نہ صرف ہضم نہ ہوئی بلکہ خلافِ واقعہ لگی۔ پھر بھی احتیاط کا دامن تھامتے ہوئے جناب سروش یوسفی نے بارہ صفحات پر مشتمل دیباچہ مزید غور و فکر کے لیے نیویارک میں مقیم اپنے بڑے بھائی جناب ارشد یوسفی کو بھجوایا، جنھوں نے کئی ضروری باتوں کی تسلی بخش وضاحت میں ایک تفصیلی ای میل (۳۱ مارچ ۲۰۱۸ء) روانہ کی، جس میں نہ صرف یوسفی صاحب سے متعلق تحقیق کے 'وثوقہ نویس' جناب طارق حبیب کے اپنی کتابوں ''یوسفیات'' اور ''مشتاق احمد یوسفی: شخصیت اور فن'' وغیرہ میں یوسفی صاحب کے اہلِ خانہ سے متعلق بیان کردہ احوال کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا بلکہ آخری کتاب سے متعلق 'نیم رضا مندی' والی بات کا بھی خاص طور برا منایا۔[۲۵] مَیں نے چونکہ یوسفی صاحب کے ذاتی احوال میں طارق حبیب ہی کی کتاب پہ زیادہ بھروسا کیا تھا، اس لیے ان وضاحتوں کے بعد مجھے اپنی تحقیقی کوتاہ دستی پر غصہ بھی آیا اور ندامت کا احساس بھی ہوا۔ بعد میں جناب ارشد یوسفی صاحب کی مستند معلومات کی روشنی میں دیباچے میں ترمیم و اصلاح کی گئی اور کتاب کی اشاعت کی نوبت بھی آ گئی۔ یہاں فی الحال ''شامِ شعرِ یاراں'' والی 'نیم رضا مندی' سے

متعلق ان کی وضاحت ملاحظہ فرمایئے:

''چونکہ آپ نے میرے والدِ محترم کے بارے میں ایک غیر تحقیق شدہ بات کو سچ سمجھ لیا ہے کہ ان کی پانچویں کتاب (شامِ شعر یاراں) ان کی نیم رضامندی کے ساتھ شائع ہوئی ہے، اس لیے مَیں اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں چند حقائق سے پردہ اٹھانا چاہوں گا، کیوں کہ میرا بھائی اور مَیں اس سلسلے میں براہ راست شریک تھے۔ ان کی پانچویں کتاب بنیادی طور پر ادبی تقریروں کی اصلاح شدہ تحریروں پر مشتمل ہے جو انھوں نے کئی برسوں میں کی تھیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ ان تحریروں میں ترمیم و اصلاح کر کے ان میں سے معیاری مضامین کو شائع کر دیا جائے۔ فیض والا مضمون ان کی کئی سالوں کی تقریریں مرتب کر کے ترتیب دیا گیا۔ ان میں سے بیشتر تقریروں کی منتظمین یا مداحوں نے ویڈیو اور آڈیو ریکارڈنگ کی تھی، جس میں تالیاں اور ہنسی صاف سنائی دیتی ہے۔ ان میں سے کچھ ریکارڈنگز یوٹیوب پر بھی دستیاب ہیں، لہٰذا کتاب میں موجود مضامین اور تقاریر کے موازنے سے میری بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔

لندن سے کراچی واپسی کے بعد خود پر مسلط کی گئی گوشہ نشینی کی ابتدائی مدت کے بعد، انھیں اکثر مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا جاتا تھا اور وہ کراچی، لاہور اور مشرقِ وسطیٰ میں منعقدہ تقریبات میں صدارتی خطبہ دیتے تھے۔ اس مجموعے کا ابتدائی مضمون وہی ہے جو انھوں نے لندن میں SOAS کے جلسے میں پڑھا، جو اُردو مرکز کے زیرِ اہتمام، ابنِ حسن برنی مرحوم کی یاد میں منعقد ہوا تھا۔ اپنی ہر تقریر پر انھوں نے ہفتوں، یہاں تک کہ مہینوں تک محنت کی تاکہ ان کا معیار بھی گزشتہ کتابوں کے مضامین جیسا ہو جائے۔ ان کی پانچویں کتاب کے اکثر مضامین میں وہی لطیف طنز، ذکاوت و ذہانت اور فلسفیانہ جادوگری ہے، جو اُن کے اسلوب کا خاصہ ہے۔ ان تقاریر کے لیے مسلسل کی جانے والی فرمائشوں نے انھیں برسوں مصروف رکھا، اور ان تقاریر کو شائع کرنے کی ہمیشہ سے ان کی خواہش تھی، لیکن چونکہ براہِ راست پیش کیے جانے کی وجہ سے ان تحریروں کا انداز اور ذائقہ مختلف تھا، لہٰذا انھیں مضامین کی حیثیت سے پیش کرنے کے لیے خاص محنت اور توجہ کی ضرورت تھی۔

کئی سالوں تک کلیدی تقاریر کرنے اور پھر اپنی بیوی کی بیماری اور دیکھ بھال کے

باوجود انھوں نے ان کی ترمیم و تہذیب پر کئی سال صرف کر کے، ان تمام تقاریر کو اشاعت کے معیار کے مطابق تیار کر دیا تھا، لیکن ان کی عمر کی وجہ سے جو کہ اب نوے کے قریب ہے، ان کے پاس اس کتاب کے اشاعتی مراحل پہ کڑی نظر رکھنے کی سکت نہ تھی۔ تب انھوں نے ذاتی طور پر مجھ سے ان مضامین کو شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا، لہٰذا میں نے وہ تمام مضامین اکٹھا کیے جن کو انھوں نے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا۔ پھر جب یہ مضامین انھیں دکھائے، تو چونکہ وہ اب اپنی عمر اور کمزوری کے باعث ان میں مزید ترمیم کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے، اس لیے تھوڑی بہت ہچکچاہٹ کے بعد، انھوں نے اس کی اشاعت کی منظوری دے دی۔ پشاور سے متعلقہ مضمون (۲۶) کا جائزہ لینے کی بابت انھوں نے پہلے ہی، پشاور یونیورسٹی میں اُردو شعبہ کی ڈاکٹر روبینہ شاہین سے بات کر رکھی تھی کہ وہ وہیں رہتی اور پڑھاتی ہیں۔ لہٰذا جب ہم نے ان سے ایڈیٹنگ کی ذمہ داری قبول کرنے کو کہا تو انھوں نے پشاور یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں اپنی کل وقتی تدریسی مصروفیات کے باوجود، حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہامی بھر لی۔ چنانچہ ڈاکٹر روبینہ شاہین، مَیں، اور ثریا (میری کزن، میرے والد کے بھائی کی بیٹی) نے ان کی کتاب کے اُردو کے پروف پڑھے، جب کہ میرے بھائی سروش اور مَیں نے جہانگیر بکس کے لیے اس کے انگریزی الفاظ و اقوال اور دیگر ماخوذات کی پروف ریڈنگ کا کام کیا۔

ڈاکٹر روبینہ شاہین کی کئی مہینوں کی مشقت اور ژرف نگاہی کی وجہ ہی سے یہ مسودات، ایک کتاب کی صورت اختیار کر پائے۔ اس دوران وہ میرے والد کے ساتھ باقاعدگی سے رابطے میں رہیں۔ وہ، میرا بھائی، میری کزن اور مَیں نے جہانگیر بکس کے ذریعہ بھیجے گئے پروف میں بہت ساری اُردو اور انگریزی کمپوزنگ کی اغلاط کو درست کرنے میں مہینوں صرف کیے۔ چونکہ ای میل سسٹم پیغامات اور منسلکات کے سائز کو محدود کرتا ہے، لہٰذا میں آپ کو اپنے والد کے ہاتھ سے لکھے گئے مسودے سے ابتدائی چند صفحات کی نقل ایک علیحدہ ای میل میسج میں بھیجوں گا، جب اسے اشاعت کے لیے تیار کرتے ہوئے، ان پر نظرِ ثانی کے بعد ان کے اوپر حتمی مسودہ (Final Draft) کے الفاظ مع تاریخ تحریر کیے گئے۔ آپ ان کا موازنہ کتاب میں

شائع مضامین سے کر سکتے ہیں۔ وہ اس کے عنوان ''شامِ شعر یاراں'' کا فیصلہ بھی کئی سال قبل کر چکے تھے، جو کہ فیض کی ایک کتاب ''شام شہر یاراں'' سے لیا گیا ہے۔ جو اُن کے اِس مضامین کے مجموعے کو شائع کرنے کے دیرینہ ارادے کا مزید ثبوت ہے۔ میرے والد نے تدوین و اشاعت کا سارا کام ڈاکٹر روبینہ شاہین اور ہمیں (اپنے بیٹوں) کو سونپ دیا تھا۔ کئی مہینوں تک جہانگیر بکس نے ہمیں اور ڈاکٹر روبینہ شاہین دونوں کو اس کے متعدد پروف بھیجے، اور ہم نے انھیں اپنے والد کو دکھایا، حالانکہ تب ان میں کئی سو صفحوں پر مشتمل ضخیم مسودے کا جائزہ لینے کی طاقت نہیں تھی۔ تاہم انھوں نے ڈاکٹر روبینہ شاہین سے بات چیت کر کے اس کتاب کے ابواب کی ترتیب کو بھی ذاتی طور پر منظور کیا۔

جب آرٹ کونسل ایک کانفرنس منعقد کرنے جارہی تھی، اُس وقت جہانگیر بکس سے یہ کتاب طباعت اور جلد کے لیے تقریباً تیار تھی۔ اس لیے آرٹس کونسل نے کتاب کی رونمائی کو کانفرنس کی کارروائی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا تھا، یہ اس کانفرنس کی پہلی تقریب تھی، جسے ڈان اخبار نے رپورٹ بھی کیا تھا۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین کو بھی اس پروگرام میں مدعو کیا گیا تھا لیکن وہ اپنے شوہر کے خاندان میں فوتیدگی کی وجہ سے اس پروگرام میں شریک نہیں ہوسکی تھیں۔

اس دوران، متعدد ٹی وی رپورٹرز نے میرے والد کا انٹرویو کیا، اور ان سے اس کتاب کی بابت تفصیلات دریافت کیں، کچھ سالوں سے چونکہ میرے والد نے اپنی کتابوں کے تمام انتظامات ہمارے سپرد کر دیے تھے، اور چند دیگر قانونی معاملات تو دس سال قبل ہی ہمیں سونپ دیے تھے۔ جب سے انھوں نے اپنے مضامین کو دوبارہ پڑھا تو جیسا کہ کوئی بھی شخص کہ جسے چورانوے یا اس سے زیادہ عمر کے خاندانی بزرگ کی خدمت کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہو، وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ اس عمر میں، Short-term memory پر اثر پڑتا ہے اور بعض اوقات حافظہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے کچھ سوالات کے جواب میں پوری دیانت داری سے کہا کہ انھیں یاد نہیں ہے، اور یہ کہ وہ اس کتاب کے بارے میں مزید تفاصیل ان کے بیٹوں سے پوچھ لیں لیکن رپورٹرز نے سروش سے تفصیلات جاننے کے بجائے، ان کے الفاظ کو توڑ

مروڑ کر پیش کیا کہ ان کی یہ کتاب ان کی اجازت یا منظوری کے بغیر شائع کی جارہی ہے، جو ہوسکتا ہے سنسنی خیز ٹی وی خبریں تو بنی ہوں لیکن تھیں بہرحال غلط۔ قائداعظم کے بارے میں ایک طویل مضمون، جسے اصل میں ''زرگزشت'' ہی کا تسلسل سمجھنا چاہیے، کو انھوں نے کبھی تقریر کے طور پر نہیں پڑھا تھا، بلکہ یہ بات ہر صاحب شعور کو سمجھ لینی چاہیے کہ وہ تو برسوں پہلے انھوں نے لکھا ہی اشاعت کی غرض سے تھا، یا محض اپنی یادداشت کو خوشگوار کرنے کے لیے۔ ڈاکٹر روبینہ شاہین (اُردو شعبہ، پشاور یونیورسٹی) کے علاوہ، ڈاکٹر فاطمہ حسن (انجمن ترقی اُردو) بھی جانتی ہیں کہ ان مضامین کو شائع کرنا ان کی دیرینہ خواہش تھی، اور کتاب کی اشاعت کو ان کی مکمل منظوری، تعاون اور اجازت حاصل تھی۔ لہٰذا یہ غلط بیانی ہے کہ اس کی اشاعت میں ان کی رنجش اور نیم رضامندی تھی۔

چونکہ آپ اس کتاب میں کسی پیش لفظ کی عدم موجودگی کو ''نیم رضامندی'' کے ثبوت کے طور پر قیاس کرتے ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرے والد کا خیال تھا کہ اس کتاب کو کسی پیش لفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک سمجھ دار قاری جان جائے گا کہ نہ صرف یہ مضامین متنوع اور مختلف طرز کے ہیں، بلکہ ہر مضمون کے اندر اس سے متعلقہ شخص، ادارے، واقعے یا موضوع کا تعارف موجود ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس میں ایک صفحے کا پیش لفظ شامل کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ نیز، اُن کی اس عمر میں (جب کتاب شائع ہوئی تھی اس وقت ان کی عمر ۹۴ سال تھی، اور مجھے نہیں معلوم کہ کسی اور شخص نے بھی نوے کی دہائی میں کبھی کسی طرح کا پیش لفظ لکھا ہو) ویسے بھی وہ سمجھتے تھے کہ اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کے لیے جس قدر جسمانی اور فکری توانائی درکار ہے، جیسا کہ انھوں نے اپنی کئی دہائیاں پہلے لکھی کتابوں میں صرف کی، وہ اب ان میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب میں کوئی دیباچہ/ پیش لفظ موجود نہیں ہے۔ اس میں آپ کے دعویٰ کے مطابق کسی طرح کی ''نیم رضامندی'' کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''(۲۷)

سچ بات تو یہ ہے کہ اگر یہ تحریریں یوسفی صاحب کی زندگی میں منصۂ شہود پر نہ آتیں تو ان کے ڈسٹ بن کی خوراک بن جانے کے واضح امکانات موجود تھے۔ ان کا یکجا ہو جانا، محبانِ یوسفی کے لیے واقعی کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ باقی رہی

اس کتاب سے متعلق ادب کے مستند قارئین کی آرا تو اس سلسلے میں سب سے پہلے تو پروفیسر جمیل احمد عدیل ہی کا نقطۂ نظر ملاحظہ ہو، جو اس کتاب کی بابت رقم طراز ہیں:

> ''راقم نے 'شامِ شعر یاراں' میں سے ابھی تک صرف نو تحریریں پڑھی ہیں۔ یوسفی کے ایک ایک لفظ نے اس قدر سیراب کیا ہے کہ کہیں تبسم تحسین بنا، کہیں قہقہہ رقص پر آمادہ ہوا تو کہیں آنسو پلکوں میں لرز کر بارگاہِ یوسفی میں توصیف کا نذرانہ پیش کرتا رہا اور قلم قدم قدم پر شہادت دیتا رہا کہ مشتاق احمد یوسفی محض مزاح نویس نہیں ہیں، وہ مجرد طناز بھی نہیں ہیں۔ درحقیقت عہدِ موجود میں وہ اُردو کے عظیم نثر نگار ہیں۔''(۲۸)

عام مزاح نگاروں میں یوسفی کی انفرادیت یہ ہے کہ اِن کا مزاح صرف ہنسنے ہنسانے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ اِس کے اندر ایک فلسفہ، ایک ذہانت، ایک تفکر، ایک دانش، ایک رچاؤ، تہذیب کی گہری آمیزش، زبان پہ ضرورت سے زیادہ دسترس، معلومات کی لامختتم بوچھاڑ، نیز انگریزی اور اُردو کے جدید اور کلاسیکل لٹریچر کا وسیع و وقیع مطالعہ ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر بات کریں، اِسے مسلسل گدگداتے، کھلکھلاتے اور تھپتھپاتے چلے جاتے ہیں۔ قدم قدم پر الفاظ کی پھلجھڑیاں سی چھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ موضوع اور ماحول اِن کے قلم کے لمس سے چمک چمک جاتا ہے۔ بات اِن کے علمی وفور سے چھلک چھلک اٹھتی ہے۔ زبان اِن کی مہارت اور بصیرت کی بلائیں لیتی نہیں تھکتی۔ یہ جملہ کمالات ان کی اپنے چہیتے قارئین کے لیے خونِ جگر سے تحریر کی گئی اس آخری سوغات میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ سچ ہے ایسی شخصیات کسی فرد، خاندان، ادارے، شہر، صوبے یا ملک ہی کا فخر نہیں ہوتیں بلکہ یہ عظیم لوگ تو زبانوں اور زمانوں کے امین ہوتے ہیں۔

بیس جون ۲۰۱۸ء بروز بدھ ایک مہربان دوست نے پُرسے کے انداز میں موبائل میسج پہ اطلاع دی کہ یوسفی صاحب گزر گئے۔ ٹی وی آن کیا تو ایک ایک چینل جنابِ یوسفی کے غم میں سوگوار دکھائی دیا۔ سوشل میڈیا سے رجوع کیا تو وہ یوسفی کے ماتم سے چھلک رہا تھا۔ شاعرِ مشرق کی وفات کے بعد مَیں نہیں سمجھتا کہ دنیائے ادب میں کسی قلم کار کی موت کو اتنے رقت انگیز انداز میں دیکھا گیا ہو۔ کئی دن تک لوگ آ آ کے بتاتے رہے کہ یار! یوسفی صاحب سِدھار گئے۔ بعض لوگ حیرت اور حسرت سے دریافت کرتے رہے کہ کیا یوسفی کو بھی موت آ گئی؟ جب احباب کی جانب سے یوسفی صاحب سے اس قدر وابستگی اور دل بستگی تسلسل اختیار کرتی گئی اور ان کا ستانوے برس کی عمر میں جانا بھی قبل از وقت محسوس ہوا، تو صحیح معنوں میں یقین آتا چلا گیا کہ ایسے لوگ مرتے نہیں، بس دنیا سے ہجرت کر کے دلوں میں مقیم ہو جاتے ہیں۔ لمحۂ موجود کے معروف شاعر شاہین عباس نے شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا:

دل سے دل تک اُسی خوشبو کا عمل جاری ہے
دل سے دل تک جو علاقہ ہے وہ سارا اُس کا(۲۹)

اور ناصر کاظمی نے بھی یقیناً دنیا سے ایسے لوگوں کے رخصت ہو جانے پر ہی یہ اشعار کہے ہوں گے:

بس اک موتی سی چھب دکھا کر، بس اک میٹھی سی دُھن سنا کر
ستارۂ شام بن کے آیا برنگِ خوابِ سحر گیا وہ
وہ مے کدے کو جگانے والا، وہ رات کی نیند اُڑانے والا
یہ آج کیا اُس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ
خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم، نظر اُسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ
وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس، ہم سخن ہمارا
سدا رہے اُس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ (۳۰)

میں نے جناب مشتاق احمد یوسفی (۴ ستمبر ۱۹۲۱ء۔۲۰ جون ۲۰۱۸ء) کے احوال و آثار کا با لاستعیاب اور بالدستیاب مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے۔ میں نے ان جیسا تکمیل پسند بلکہ تکمیل و تجلیل و تزئین پرست (Perfactionist) آج تک نہیں دیکھا۔ وہ تعلیم کے میدان میں داخل ہوئے تو بورڈز اور یونی ورسٹیوں کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیے، ملازمت کرنے کی ٹھانی تو اس کی انتہائی بلندیوں کو جا چھوا اور پھر جب تصنیف و تالیف کی دنیا میں قدم رکھا تو ادبی دنیا کو ایک انوکھے، نرالے اور اچھوتے معیار، اعتبار اور اقدار سے آشنا کر دیا۔ ان کی گوشہ نشینی ہمیشہ، توشہ آفرینی پر منتج ہوتی تھی۔ انگریزی کے ممتاز نقاد لان جائنس نے ادب میں ترفع (SUBLIME) کا نظریہ متعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ بڑا ادب پارہ وہ ہوتا ہے جو محض اخلاقیات یا معلومات بہم نہ پہنچائے بلکہ اسے ذوقِ سلیم رکھنے والا ہر درجے کا قاری جب بھی پڑھے تو عش عش کر اُٹھے۔ مشتاق احمد یوسفی کی تمام تحریروں کو بلا شبہ اور بلا مبالغہ 'ترفع' کے اسی اعلیٰ معیار پر نہایت فخر اور اعتماد کے ساتھ پرکھا جا سکتا ہے۔

جناب مشتاق احمد یوسفی اس کتاب میں بھی تشبیہ، استعارہ، موازنہ، تضاد، برجستگی، بذلہ سنجی، نغز، صورتِ واقعہ، رمز، مبالغہ، ایہام، رعایتِ لفظی، تحریف، علامت، ہزل، دشنام، عریانی اور طنز سمیت مزاح کے ہر حربے کو با لاستعداد و بالاستعجاب کام میں لائے ہیں، اور ہر جگہ مزاح کے نتھرے اور بلیغ معیار کو قائم و دائم رکھا ہے۔ جملہ تراشنے اور ہر موقع و مزاج کے مطابق لفظ کھوجنے اور برتنے میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔ ان کے ہاں الفاظ نگینوں کا روپ دھارتے چلے جاتے تھے۔ ان کی آمد سے اردو ادب اور بالخصوص اردو مزاح کو وہ اعتماد اور عروج میسر آیا کہ وہ دنیائے ادب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے قابل ہو گیا۔ 'چراغ تلے' سے 'شامِ شعرِ یاراں' تک انھوں نے نہ صرف اپنے اوجِ کمال کو برقرار رکھا بلکہ قلم کاری کے ان پچپن سالوں میں ان کے معیار کا سفر اُفقی و عمودی سطحوں پر متواتر پھلتا پھولتا نظر آیا۔

ان کے ہاں ادق سے ادق موضوع بھی مہک مہک اٹھتا ہے اور عام سے عام ترکیب بھی لَو دینے لگتی ہے۔ شگفتہ

منظر نگاری اور لطیف جزئیات رسی ان کے فن کی نمایاں جہتیں ہیں۔ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے تو وہ موضوع اور ہدف کا اتنی دیر تک اور دور تک پیچھا کرتے ہیں کہ قاری کے قیاسات کا سانس ٹوٹنے لگتا ہے مگر حیرت ہے کہ ان کی تحریر کی تروتازگی اور بے ساختگی پر اضمحلال کا ذرا سا شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ خشک سے خشک مباحث سے بھی شگفتگی و شستگی کے بہتر سے بہتر امکانات پیدا کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنجر سے بنجر زمین بھی ان کے قلم کے لمس سے آشنا ہونے کے بعد لہلہانے لگتی ہے اور اُن کے قدم رکھنے سے ویران سے ویران رہ گزر میں بھی گج وَج کے بہار آ جاتی ہے۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ ''یوسفیات'' اصل میں ایک رنگ، ڈھنگ یا آہنگ کا نہیں بلکہ ایک ادبی عقیدے کا نام ہے، اور یہ بھی خیال آتا ہے کہ ایک ادیب یا ادب کے قاری ہونے کا دعویٰ رکھنے کے بعد اس عقیدے پہ ایمان لائے بغیر مرنا بھی کوئی مرنا ہے۔ مَیں اپنی اِس عرض داشت کا اختتام ڈاکٹر تحسین فراقی کے اِس اقتباس پر کرنا چاہوں گا:

> ''اُردو نثر میں ظرافت کی جوت بہت سوں نے جگائی ہے مگر یوسفی اِن سب میں سربرآوردہ ہیں..... حقیقت یہ ہے کہ کلاسک کا دودھ پیے بغیر کوئی تخلیقی 'شیر خوار' پروان نہیں چڑھ سکتا۔ یوسفی نے کلاسک کا دودھ پی کر اس سے توانائی بھی حاصل کی ہے اور اس کو مِتھ کر اس کا جوہر بھی نکال لیا ہے..... جان لیجیے مزاح کے چاند کب کے سِدھار چکے، اب ظرافت کے نیّرِ اعظم کی حکمرانی ہے۔''(۳۱)

حواشی

(۱) بشیر احمد باوا، پہلا دیوان، (شیخوپورہ: بشیر باوا اکیڈمی آف کلچر اینڈ تھاٹ) ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۔ ۱۴

(۲) پروفیسر جمیل احمد عدیل، کالم: مطبوعہ روزنامہ نئی بات، ۱۰ نومبر ۲۰۱۴ء

(۳) مشتاق احمد یوسفی، قائدِ اعظم فوج داری عدالت میں، مشمولہ شامِ شعر یاراں، جہانگیر بکس، لاہور، ۲۰۱۴ء، پانچوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۵، ۸، ۱۰، ۱۰، ۱۶

(۴) ایضاً، ص ۲۳

(۵) ایضاً، کیس ہسٹری، ایضاً، تینوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۴۵، ۳۶، ۴۳

(۶) ایضاً، ایسا کہاں سے لائوں کہ تجھ سا کہوں جسے، ایضاً، آٹھوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۵۳، ۵۳، ۵۵، ۵۹، ۶۵، ۶۶، ۶۰، ۶۳

(۷) ایضاً، انڈس ویلی اسکول آف آرٹ اینڈ آرکیٹکچر، ایضاً، دونوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۶۹، ۷۰

(۸) ایضاً، کلاہِ مسمریزی، ایضاً، چاروں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۹۲، ۸۳، ۸۷، ۹۶

(۹) ایضاً، فرمودات فیضی، ایضاً، تینوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۶

(۱۰) ایضاً، لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز، ایضاً، تینوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۱۲۰، ۱۱۶، ۱۲۰

(۱۱) ایضاً، نیرنگِ فرہنگ، ایضاً، دونوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۱۴۱، ۱۲۷

(۱۲) ایضاً، مہرِ دو نیم، ایضاً، دونوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۱۵۷، ۱۵۰

(۱۳) ایضاً، چادر، چاند بی بی اور کالم بھر چاندنی، ایضاً، دونوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۱۶۱، ۱۶۹

(۱۴) ایضاً، یادِ یارِ طرح دار، ایضاً، تینوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۱۸۳، ۱۹۸، ۲۱۸

(۱۵) ایضاً، آم، روہو اور بچھو، ایضاً، آٹھوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۲۳۵، ۲۳۸، ۲۳۸، ۲۴۲، ۲۴۴، ۲۳۱، ۲۳۹، ۲۴۶

(۱۶) ایضاً، ضمیرِ واحد متبسم، ایضاً، پانچوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۲۵۵، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۶۸

(۱۷) ایضاً، مسندِ صدارت پر اولتی کی ٹپاٹپ، ایضاً، تینوں ں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۲۷۷، ۲۸۱، ۲۸۲

(۱۸) ایضاً، شاہ جی کی کہانی، دوسرے شاہ جی کی زبانی، ایضاً، تینوں ں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۲۹۲، ۲۹۶، ۳۰۱

(۱۹) ایضاً، الطاف گوہر اور گُڑ کی ڈلی، ایضاً، پانچوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۳۰۸، ۳۰۸، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۲

(۲۰) ایضاً، یہاں کچھ پھول رکھے ہیں، ایضاً، صفحہ نمبر ۳۵۳

(۲۱) ایضاً، میں اختتام ہوں اِک عہد کے فسانے کا، ایضاً، دونوں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۳۵۸، ۳۵۹

(۲۲) ایضاً، پلکوں سے پینٹ کرنے والا مصور، ایضاً، تینوں ں مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۳۶۲، ۳۶۶، ۳۶۷

(۲۳) ایضاً، قصہ خوانی بازار سے کوچۂ ماضی گیراں تک، ایضاً، دس مثالوں کے صفحات بالترتیب: ۳۸۱، ۳۹۵، ۳۹۹، ۴۰۲، ۴۰۴، ۴۱۲، ۴۱۶، ۴۱۸، ۴۳۶، ۴۳۶

(۲۴) خرم سہیل، کالم: مطبوعہ روزنامہ دی اردو ٹائمز، انڈیا، ۲۷ جنوری ۲۰۱۵ء

(۲۵) وہ ای میل، اے فور کے چھے صفحات پر مشتمل میرے پاس محفوظ ہے، جو یوسفی صاحب کے اہلِ خانہ اور آخری سالوں کی صورتِ حال سے متعلق نہایت اہم دستاویز ہے اور جسے کسی وقت حواشی کے ساتھ اُردو/ انگلش دونوں زبانوں میں شائع کیا جائے گا۔

(۲۶) شامِ شعرِ یاراں کے آخری مضمون قصہ خوانی بازار سے کوچۂ ماضی گیراں تک کی طرف اشارہ ہے۔

(۲۷) ارشد یوسفی، ای میل (چھے صفحات)، ترجمہ: ذونیرا بخاری، ۳۱ مارچ ۲۰۱۸ء

(۲۸) پروفیسر جمیل احمد عدیل، کالم: مطبوعہ روزنامہ نئی بات، ۱۱ مئی ۲۰۱۵ء

(۲۹) شاہین عباس، تحُیر، کُتب نما پبلشرز، لاہور ۱۹۹۸ء، ص ۴۶

(۳۰) ناصر کاظمی، غزل، مشمولہ دیوان، جہانگیر بکس، لاہور، س ن، ص: ۱۴۵۔ ۱۴۴

(۳۱) ڈاکٹر تحسین فراقی، مشتاق احمد یوسفی (زمیں یاں کی چہارم آسمان ہے) مشمولہ معاصر اُردو ادب: نثری مطالعات، کلیہ علومِ اسلامیہ و شرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۶، ۱۵۴، ۱۵۲

مآخذ:

(۱) باوا، بشیر احمد، پہلا دیوان، بشیر باوا اکیڈمی آف کلچر اینڈ تھاٹ، شیخوپورہ، ۲۰۱۳ء

(۲) عباس، شاہین، تحریر، لاہور: کُتب نما پبلشرز، ۱۹۹۸ء
(۳) فراقی، تحسین، ڈاکٹر، مشتاق احمد یوسفی (زمیں یاں کی چہارم آسمان ہے) مشمولہ معاصر اُردو ادب: نثری مطالعات، کلیہ علومِ اسلامیہ وشرقیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۰ء
(۴) کاظمی، ناصر، غزل، مشمولہ دیوان، لاہور: جہانگیر بکس، س ن
(۵) یوسفی، مشتاق احمد، شامِ شعر یاراں، لاہور: جہانگیر بکس، ۲۰۱۴ء

اخبارات ورسائل

(۱) روزنامہ دی اردو ٹائمز، انڈیا، ۲۷ جنوری ۲۰۱۵ء
(۲) روزنامہ نئی بات، ۱۰ نومبر ۲۰۱۴ء
(۳) روزنامہ نئی بات، ۱۱ مئی ۲۰۱۵ء